علمِ تفسیر پر ایک نظر (۳)

جناب تحسین بلخی، کینیڈا

دورِ صحابہؓ میں تفسیر

رہی دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں تفسیر کی کیفیت، تو جہاں تک تفسیر قرآن کے اس غیر معمولی ذخیرے کا تعلق ہے جو آج ہمارے سامنے ہے، اس کا پتہ اس زمانے میں بھی نہیں ملتا۔ یہ ساری کاوشیں تابعین اور بعد کے ادوار کی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس زمانے میں قرآن کی تفسیر و تشریح کا سرے سے کوئی کام ہی نہیں ہوا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ صحابہؓ عموماً قرآن کی تفسیر میں شدت کے ساتھ احتیاط برتتے تھے، کیونکہ حدیثوں میں تفسیر بالرائے کی ممانعت اور اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے، مثلاً حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

مَن قال فی القرآن برایہ فلیتبوا مقعدہ من النار[۴۶]

"جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کہے، اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے"۔

اس بنا پر صحابہؓ کو دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن کی تفسیر میں غلطی ہو جائے اور وہ تفسیر بالرائے میں شمار ہو کر خدا کی گرفت کا سبب بن جائے، جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک موقع پر فرمایا کہ :

"کون سا ایسا آسمان مجھ پر سایہ فگن ہو گا اور کونسی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی اگر میں قرآن میں کچھ اپنی رائے سے یا بغیر علم کے کہوں[۴۷]"۔

لیکن صحابہؓ کی شدت احتیاط کا یہ طرز عمل ان آیتوں سے متعلق تھا جن کا براہ راست تعلق انسانی کردار و عمل سے نہیں تھا، لیکن وہ آیتیں جن میں بندوں سے کسی کام کے کرنے کا

مطالبہ یا کسی کام سے پرہیز کا حکم ہے' تو ان کی تشریح و توضیح خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال و افعال سے فرمادی تھی۔ صحابہؓ چونکہ سراپا عمل تھے ان کے سامنے اپنی اصلاح اور مخلوق خدا کی فلاح و بہبود تھی' اس لئے خدا کے امر و نہی سے متعلق آیات کے مدعا کی تبلیغ وہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے' خصوصاً اس صورت حال کی بنا پر کہ اس زمانے میں اسلامی مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا' تو یہ کیسے ممکن تھا کہ صحابہؓ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آنہ ہوتے۔ اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے کی خاطر سب سے پہلے ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ قرآن کی تفسیر و تشریح کے باب میں اپنی علمی بصیرت کو کام میں لائیں۔

چنانچہ صحابہؓ کی ایک خاصی تعداد ایسی تھی جو قرآن کی تشریح و تفسیر کیا کرتی تھی' لیکن جیسا کہ پہلے بتایا گیا' ان کی تفسیروں کا زیادہ تر تعلق انہی آیات سے ہوتا تھا جو امر و نہی پر مشتمل ہیں' اور وہ آیات جن کا براہ راست تعلق انسانی عمل و کردار سے نہیں ہے ان کی تفصیل میں جانے اور ان کی تعبیر و تفسیر کرنے سے وہ بہت احتیاط کرتے تھے کہ مبادا بیان میں کوئی غلطی ہو جائے اور امت ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جائے۔

مشہور مفسرین صحابہؓ

ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دس وہ جلیل القدر اور مشہور صحابہؓ ہیں جن سے زیادہ تر تفسیری روایتیں منقول ہیں اور وہ یہ ہیں [۴۸]

۱۔ حضرت ابوبکرؓ متوفی ۱۳ھ	۲۔ حضرت عمرؓ شہادت ۲۴ھ
۳۔ حضرت عثمانؓ شہادت ۳۵ھ	۴۔ حضرت علیؓ شہادت ۴۰ھ
۵۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ متوفی ۳۲ھ	۶۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ متوفی ۶۸ھ
۷۔ حضرت ابی بن کعبؓ متوفی ۱۹ھ [۴۹]	۸۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ متوفی ۴۴ھ [۵۰]
۹۔ حضرت زید بن ثابتؓ متوفی ۴۵ھ [۵۱]	۱۰۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شہادت ۷۲ھ

ان میں سب سے زیادہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے تفسیری جواہرامتِ مسلمہ کو ملے ہیں [۵۲]' اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے

دعا فرمائی تھی کہ "یا اللہ ان (ابن عباسؓ) کو کتابِ الٰہی کا علم عطا فرما" ۵۳۔ چنانچہ ان کی قرآن فہمی سے متأثر ہو کر ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ "یہ شخص بوڑھوں کا جوان ہے" ۵۴۔ یعنی جوان ہونے کے باوجود بوڑھوں جیسا وسیع اور پختہ علم رکھتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان کو "ترجمان القرآن" کہا کرتے ۵۵۔ اور حضرت ابن الحنفیہ (م ۸۱ھ) ان کو "حِبرُ الاُمۃ" کے لقب سے یاد کیا کرتے ۵۶۔

ان دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ حضرت انسؓ (م ۹۳ھ) حضرت ابو ہریرہؓ (م ۵۸ھ) حضرت عبداللہ بن عمرؓ (م ۷۴ھ) حضرت جابر بن عبداللہؓ (م ۷۸ھ) اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص (م ۶۵ھ) سے بھی تفسیری روایتوں کی خاصی تعداد منقول ہے ۵۷۔

دورِ صحابہؓ میں تفسیر کی نوعیت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قرآن حکیم کی جو تفسیریں منقول ہیں، ان کا بیشتر حصہ قرآن کے مفرد اور غریب الفاظ کی تشریح سے تعلق رکھتا ہے۔ یا آیاتِ احکام سے متعلق کوئی حدیث انہیں معلوم ہوتی تو وہی ان آیات کی توضیح و تشریح میں بیان کر دیا کرتے اور اگر کوئی حدیث انہیں معلوم نہ ہوتی، تو مفروضہ مسائل قائم کر کے تفسیری مباحث نہ چھیڑتے۔ البتہ اگر کوئی مسئلہ آن پڑتا اور کوئی معاملہ پیش آتا اور وقت کا تقاضا ہوتا کہ اس کا حل نکالا جائے تو پھر خود ہی فقہی نقطہ نظر سے تفسیر و تشریح کرتے ۵۸۔ رہے اعتقادی مسائل یا اسرارِ کائنات سے متعلق تفسیریں، تو اس باب میں صحابہ کرامؓ سے بہت کم تفسیریں پائی جاتی ہیں۔ اس طرح ہم با آسانی کہہ سکتے ہیں کہ دورِ صحابہؓ کی تفسیر لغوی، اثری اور قدرے فقہی تھی۔

کیا تفسیر میں کوئی تالیف ہوئی؟

یہ بات تو یقینی ہے کہ دورِ صحابہؓ میں نہ تفسیری مذاہب پیدا ہوئے تھے اور نہ تفسیر نے کوئی مستقل جداگانہ فن کی حیثیت اختیار کی تھی، اور چونکہ تفسیر نے کوئی مستقل جداگانہ فن کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی اس لئے کچھ یقین ہی کی حد تک یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ دورِ صحابہؓ میں مستقل طور پر خاص تفسیر میں کتابیں نہیں لکھی گئیں، بلکہ اس دور میں

جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی وہ معلومات جمع کیں جو انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوئی تھیں' یعنی انہوں نے حدیث و سنت کے جو مجموعے لکھے یا اپنے تلامذہ کو لکھوائے' انہی مجموعوں میں وہ تفسیری جواہر بھی تھے جو انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تھے --- تاہم دور صحابہؓ کی دو ایسی کتب تفسیر کا سراغ ملتا ہے جو اس دور میں مستقل طور پر قلمبند کی گئی تھیں :

(الف) تفسیر ابن عباسؓ: اس کی بابت امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) کا یہ قول منقول ہے کہ :

> "مصر میں تفسیر کا ایک نسخہ ہے جس کو علی بن ابی طلحہ (م ۱۴۳ھ) نے روایت کیا ہے' اس نسخہ کے لئے اگر کوئی مصر تک کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرے تو کوئی بڑی بات نہیں"[۵۹]۔

یہی وہ نسخہ ہے جس پر امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول تفسیری روایات کے باب میں اعتماد کیا ہے [۶۰]۔ اور یہ نسخہ --- جیسا کہ علامہ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) کا بیان ہے --- لیث بن سعد (م ۱۷۵ھ) کے کاتب ابو صالح عبداللہ بن صالح (م ۲۲۳ھ) کے پاس تھا جس کو انہوں نے بواسطہ معاویہ بن صالح (قاضی اندلس م ۱۵۸ھ) سے روایت کیا تھا اور معاویہ بن صالح نے علی بن ابی طلحہ سے سنا تھا اور علی بن ابی طلحہ براہ راست حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں' اور ابو صالح سے امام بخاری تک پہنچا[۶۱]۔

لیکن چونکہ علی بن ابی طلحہ کا سماع حضرت ابن عباسؓ سے ثابت نہیں اور ائمہ حدیث کا اس عدم سماع پر اجماع ہے [۶۲]' اور علامہ ابن حجر عسقلانی بھی لکھتے ہیں کہ وہ (علی بن ابی طلحہ) حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے نہیں سنا ہے' بلکہ ان کے اور حضرت ابن عباسؓ کے درمیان مجاہد (م ۱۰۴ھ) واسطہ ہیں [۶۳]۔ اس لئے اس شبہ یا اعتراض کا جواب علامہ ابن حجر عسقلانی یہ دیتے ہیں کہ جب علی بن ابی طلحہ اور حضرت ابن عباسؓ کا درمیانی واسطہ معلوم ہو گیا اور یہ بھی کہ وہ ثقہ ہے تو پھر علی بن ابی طلحہ کی حضرت ابن عباسؓ سے اس نسخہ کی روایت مان لینے میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی[۶۴]۔

لیکن حیرت ہے کہ واسطہ چاہے ثقہ ہو' لیکن علامہ ابن حجر عسقلانی نے ان سخت قسم کی

جرحوں کو کیسے نظرانداز کر دیا جو علی بن ابی طلحہ پر امام احمد بن حنبل اور ابوداؤد وغیرہ محدثین و ائمہ رجال نے کی ہیں' اور جن کو خود علامہ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب "تہذیب التہذیب" میں نقل کیا ہے' یہاں تک کہ علامہ ابن حجر عسقلانی کے قول کے مطابق چونکہ علی بن ابی طلحہ اپنی رائے' اپنے خیالات اور اپنے مسلک کے لحاظ سے امام بخاری وغیرہ محدثین کی نظر میں سخت ناپسندیدہ تھے' اس لئے امام بخاری اپنی صحیح میں بکثرت باتیں جو تراجم وغیرہ میں نقل کرتے ہیں وہ معاویہ بن صالح کی وہی تفسیری روایت ہوتی ہیں جو بواسطہ علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس ہیں' لیکن وہ (امام بخاری) علی بن ابی طلحہ کا نام نہیں لیتے بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ "ابن عباس نے کہا" یا یہ کہ "ابن عباس سے یہ مذکور ہے"۔[۶۵]

تو پھر علی بن ابی طلحہ اور حضرت ابن عباسؓ کا درمیانی واسطہ اگر ثقہ ہو تو بھی کیا علی بن ابی طلحہ کے متعلق علامہ ابن حجر عسقلانی کی فراہم کردہ معلومات کے باوجود محدثین کے اصول سے اس نسخہ کی صحت کے باب میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی؟ اس کا جواب علامہ ابن حجر عسقلانی کے متذکرہ بالا قول میں نظر نہیں آتا۔

پھر جن ابو صالح (عبداللہ بن صالح م ۲۲۳ھ کاتب لیث بن سعد م ۱۷۵ھ) سے یہ نسخہ امام بخاری کو ملا اور جن سے امام بخاری روایت کرتے ہیں' ان کے بارے میں ائمہ رجال نے جو جرحیں کی ہیں ان سب سے قطع نظر صرف ایک اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ ان (ابو صالح) کے اور ان کے ایک پڑوسی کے درمیان کچھ عداوت تھی' ان کا وہ پڑوسی حدیثیں وضع کرتا اور ابو صالح کے خط کے مشابہ خط میں لکھ کر ان کے گھر میں ان کی کتابوں کے درمیان پھینک دیتا تھا' ابو صالح یہ سمجھتے کہ یہ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہے چنانچہ وہ اس کی روایت کر دیا کرتے[۶۶] تو پھر بھی اس نسخہ کی صحت محل نظر ہو جاتی ہے کیونکہ پھر اس نسخہ کی بابت قدرتاً ذہن وہ یقینی ذریعہ معلوم کرنا چاہتا ہے جس سے یہ علم و اطمینان حاصل ہو کہ ابو صالح سے امام بخاری کو جو نسخہ ملا تھا وہ بعینہٖ وہی تھا جو حضرت ابن عباسؓ نے لکھا' یا لکھوایا اور ابو صالح کے یہاں ان کے اس پڑوسی کی کارستانی سے اس کے اندر کسی طرح کا خلط ملط نہ ہوا۔

اور پھر ان تمام باتوں سے قطع نظر یہ بات بہرحال قابل غور و توجہ ہے کہ گفتگو اس باب میں ہو رہی ہے کہ دورِ صحابہؓ میں کسی صحابی نے خاص تفسیر میں مستقل طور پر کوئی تالیف کی یا نہیں' اور جب علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباسؓ سے کچھ سنا ہی نہیں تو پھر یہ بات کس طرح کہی جا سکتی ہے کہ یہ نسخہ خود حضرت ابن عباسؓ کا لکھا ہوا یا لکھوایا ہوا تھا۔ یہ بات تو اسی وقت کہی جا سکتی ہے جب اس کی تصریح ہو کہ علی بن ابی طلحہ نے جس نسخہ کی روایت کی ہے وہ ان کو اس درمیانی واسطہ (مجاہد) سے ملا تھا اور اس درمیانی واسطہ (مجاہد) کو وہ نسخہ حضرت ابن عباسؓ نے عطا کیا تھا یا انہیں املا کرایا تھا اور مجاہد نے علی بن ابی طلحہ کو منتقل کیا' جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کی "الصحیفۃ الصادقہ" کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ نسخہ ان سے ان کے صاحبزادے (محمد) کو ملا اور ان سے ان کے صاحبزادے (شعیب) کو ملا اور شعیب سے ان کے لڑکے عمرو (بن شعیب بن محمد بن عبد اللہ بن عمرو بن العاص) متوفی ۱۱۸ھ کو ملا۔

لیکن یہاں تو ایک نسخہ ہے جس کی روایت علی بن ابی طلحہ کرتے ہیں' جو ان کو حضرت ابن عباسؓ سے بہرحال نہیں ملا' پھر کیا مجاہد سے ملا؟ اور کیا مجاہد کو حضرت ابن عباسؓ سے ملا تھا؟ یہ کوئی نہیں بتاتا۔ صرف علی بن ابی طلحہ اور حضرت ابن عباسؓ کے درمیانی واسطہ سے حجاب اٹھایا جاتا ہے اور یہ کہ وہ ثقہ ہے۔ مان لیجئے کہ واسطہ بھی ثقہ ہے' اور اس واسطہ سے روایت کرنے والا راوی بھی ثقہ ہے' لیکن یہ احتمال بہرحال موجود ہے کہ انہوں نے مجاہد سے جو سنا ہو وہ خود لکھ لیا ہو' اور اس کی روایت کرتے ہوں یا اس درمیانی واسطہ نے علی بن ابی طلحہ کو املا کرا دیا ہو' نہ یہ کہ اس درمیانی واسطہ نے علی بن ابی طلحہ تک کوئی ایسا نسخہ منتقل کیا ہو جو حضرت ابن عباسؓ کا مکتوبہ ہو اور اس درمیانی واسطہ کو حضرت ابن عباسؓ نے دیا ہو یا لکھوایا ہو۔ ایسی صورت میں یہ تالیف تابعی کی ٹھہرتی ہے نہ کہ صحابی کی۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مجاہد نے ایک تفسیر لکھی تھی (جس کا تذکرہ آگے اپنے مقام پر آئے گا) اور علی بن ابی طلحہ کو وہ تفسیر مل گئی یا انہوں نے اس کی نقل کر لی یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجاہد نے ان کو املا کرائی اور چونکہ مجاہد حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں' اس لئے علی بن ابی طلحہ اس کی روایت براہ راست حضرت ابن عباسؓ سے

کرنے لگے اور لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ حضرت ابن عباسؓ کی تالیف ہے اور یوں وہ تفسیر ابن عباس کے نام سے مشہور ہو گئی' یہاں تک کہ ابو صالح کے ذریعہ وہ امام بخاری تک پہنچی .... حاجی خلیفہ نے جہاں سفیان بن عیینہ اور وکیع بن الجراح وغیرہ کی تالیف کردہ ان کتب تفسیر کا تذکرہ کیا ہے جن میں صحابہؓ اور تابعین کے اقوال جمع کئے گئے ہیں وہیں اسی قبیل کی کتب تفسیر کی تالیف کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ثم بعد هولاء طبقة اخرٰی منهم عبد الرزاق وعلی بن ابی طلحة وابن جریر وابن ابی حاتم .... الخ" [۶۷]۔ اور احتمال کی حد تک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے جو احادیث وسنن قلمبند کی تھیں یا اپنے تلامذہ کو لکھوائی تھیں اور ان میں تفسیر سے متعلق بھی ارشاداتِ نبویہ تھے' اور خود حضرت ابن عباسؓ کے جو افادات ان کے تلامذہ نے لکھے تھے' وہ سب یکجا تھے' لیکن بعد میں ان میں سے کسی نے تفسیر کا حصہ علیحدہ کر لیا یا نقل کر لیا اور وہ علی بن ابی طلحہ کو مل گیا اور لوگوں نے اسے حضرت ابن عباسؓ کی خاص تفسیر میں ایک الگ مستقل تالیف کی حیثیت دے دی۔

(ب) تفسیر ابی بن کعبؓ: دوسری تالیف جو خاص تفسیر میں مستقل تالیف کی حیثیت سے صحابی کی بتائی جاتی ہے وہ ہے "تفسیر ابی بن کعبؓ" جس کا تعارف علامہ سیوطی اس طرح کراتے ہیں کہ ابی بن کعب سے ایک بڑا نسخہ (مروی) ہے' جس کو ابو جعفر رازی نے بواسطہ ربیع بن انس عن ابی العالیہ عن ابی بن کعب روایت کیا ہے۔ اور یہ باسنادِ صحیح ہے' اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس سے بکثرت روایتوں کی تخریج کی ہے اور اسی طرح حاکم (م ۴۰۵ھ) نے اپنی مستدرک میں اور احمد (ابن حنبل م ۲۴۱ھ) نے اپنی مسند میں تخریج کی ہے [۶۸]۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے محدثین اور ائمہ رجال نہ ربیع بن انس (م ۱۳۹ھ) سے مطمئن و خوش ہیں اور نہ ابو جعفر الرازی (عیسیٰ بن ابی عیسیٰ ماہان) سے۔ ربیع بن انس میں تو ابن معین (م ۲۳۳ھ) کو تشیع اور "بافراط تشیع" (کان یتشیع فیفرط) نظر آتا ہے اور ابن حبان انہیں ثقات میں سے تو شمار کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس بات کی بھی خبر دیتے ہیں کہ ان کی ان مرویات سے لوگ اجتناب کیا کرتے جن کو ابو جعفر الرازی روایت کرتے کیونکہ ابو جعفر الرازی کی ان روایات میں بکثرت اضطراب ہے جو عن الربیع بن

انس" ہیں ۶۹۔ اور ابو جعفر الرازی امام احمد بن حنبل کی نظر میں روایت کرنے میں غلطیاں کیا کرتے اور حافظ ابو زرعہ (۲۶۴ھ) کی معلومات یہ تھیں کہ ان (ابو جعفر الرازی) کو بکثرت وہم لاحق ہوتا اور ابن خراش (م ۲۸۳ھ) ان کو سچا تو کہتے ہیں مگر ساتھ ہی ان کے حافظہ اور ان کی یادداشت کو بہت خراب بتاتے ہیں۔ اور ابن حبان یہ خبر دیتے ہیں کہ وہ منکر باتیں روایت کیا کرتے اور سند میں مشاہیر کے نام استعمال کر لیتے ۷۰۔ (شاید حافظہ کی خرابی کا اثر ہو) اور اس کی تائید علامہ ذہبی کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ یا دوسرے صحابی سے معراج کے باب میں ایک ایسی طویل حدیث روایت کی گئی ہے جس میں نہایت منکر اور نازیبا الفاظ ہیں اور اس روایت کی سند یہ ہے :ابو جعفر الرازی عن الربیع بن انس عن ابی العالیہ عن ابی ہریرہ ۷۱۔

اس صورت حال کی بنا پر حضرت ابی بن کعبؓ سے (مروی) بالفاظ علامہ سیوطی اس "نسخة كبيرة" (ایک بڑا نسخہ) کے بارے میں کیا کہا جائے؟ اور جہاں تک علامہ سیوطی کے اس قول کا تعلق ہے کہ "یہ باسناد صحیح ہے"" تو معلوم نہیں ان کے اسناد کو "صحیح" کہنے کا مطلب کیا ہے؟ ممکن ہے مطلب یہ ہو کہ یہ اسناد اپنے متصل ہونے کے لحاظ سے صحیح ہے' یعنی درمیان سے کوئی راوی ساقط نہیں ہے' جیسا کہ علی بن ابی طلحہ والی روایت کردہ "تفسیر ابن عباسؓ" والے قضیہ میں علی بن ابی طلحہ اور حضرت ابن عباسؓ کا درمیانہ راوی ساقط ہے۔

پھر ابن ندیم نے ابی بن کعبؓ کے اس نسخہ کا تذکرہ ان کتابوں میں کیا ہے جو "فضائل القرآن" میں تالیف کی گئیں ۷۲۔ اس سے یہ خیال گزرتا ہے کہ ممکن ہے حضرت ابی بن کعبؓ نے کوئی ایسا مجموعہ قلمبند کیا ہو جس میں قرآن اور اس کی تعلیم و تعلم سے متعلق کچھ ایسی حدیثیں ہوں جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوں۔ اگر ایسا تھا تو یہ کتاب کوئی کتابِ تفسیر قرار نہ پائے گی' لیکن بعض علمائے سلف ایسی کتابوں کو بھی کتبِ تفسیر کے ذیل میں درج کر دیتے ہیں جن کا کوئی بھی تعلق قرآن سے ہوتا ہے' مثلاً حاجی خلیفہ نے سیوطی کی "الاتقان فی علوم القرآن" اور زرکشی کی "البرہان فی علوم القرآن" کو بھی کتب تفسیر میں شمار کرایا ہے ۷۳' حالانکہ ان کا تعلق ایسے مسائل و مباحث سے ہے جن کا

جاننا قرآن کی تفسیر کرنے کے لئے ضروری ہے' نہ کہ یہ کتابیں بجائے خود قرآن کی تفسیریں ہیں۔ حتیٰ کہ ایک کتاب "تعداد الآی" کو بھی حاجی خلیفہ نے کتب تفسیر میں شمار کرایا ہے [۷۴] — حالانکہ اس کے نام ہی سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں محض آیتوں کی تعداد کا شمار و بیان ہو گا۔

لیکن یہاں پھر ایک مشکل پیش آتی ہے' وہ یہ کہ حضرت ابی بن کعب سے ہر ہر سورۃ کی فضیلت میں جو روایت ملتی ہے' اس کو ہمارے محدثین اور علمائے تفسیر موضوع کہتے ہیں [۷۵]۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوتا ہے کہ ابن ندیم نے حضرت ابی بن کعبؓ کی تالیف کردہ جس کتاب کا تذکرہ کیا ہے' وہ اگر ان کی طرف غلط منسوب نہیں کر دی گئی ہے تو پھر اس نسخہ کے راویوں کے بارے میں کتب رجال کی فراہم کردہ معلومات کو دیکھتے ہوئے اس امکان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ پھر بعد میں آگے چل کر اس نسخہ کے اندر بہت کچھ الحاق و ازدیاد ہو گیا تا آنکہ وہ "نسخة کبیرة" بن گیا۔

یا پھر یہ کہا جائے کہ علامہ سیوطی نے جس نسخہ کا تذکرہ کیا ہے' وہ وہ کتاب نہیں ہے جس کا تذکرہ ابن ندیم نے کیا ہے' بلکہ صورت واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ کی مجالسِ درس میں جو تفسیری افادات سنے گئے ان کو ان کے تلامذہ حلقہ درس سے جب اپنے گھروں میں آتے تو اپنے پاس محفوظ رکھنے کے خیال سے از خود ضبطِ تحریر میں لاتے رہے' بغیر اس کے کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے املا کرایا ہو' یا ان کے بعد ان کے تلامذہ ضبط تحریر میں لے آئے' اور اس نسخہ کی روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے کرنے لگے' کیونکہ سنا تو بہر حال تھا ہی اور واقعہ کی اس نوعیت کا بخوبی امکان ہے کیونکہ ابو العالیہ نے ایک تفسیر لکھی تھی جس کے بارے میں حاجی خلیفہ لکھتے ہیں کہ "رواه الربيع بن انس عنه" [۷۶]۔ جس کا تذکرہ آگے اپنے مقام پر آئے گا' ہو سکتا ہے کہ وہ (ابو بکر العالیہ) اسی کی روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے کرتے ہوں' بلکہ بنظر غائر دیکھا جائے تو کچھ اس کی تائید ہی کرتا ہے' کیونکہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے ایک تفسیر قلمبند کی تھی' بلکہ ان کا جملہ یہ ہے کہ "فعنه نسخة كبيرة"۔ یعنی' ابی بن کعب سے ایک بڑا نسخہ (مروی) ہے۔ جس کی روایت ابو جعفر الرازی عن الربیع بن انس عن ابی العالیہ عن ابی بن کعبؓ کرتے

ہیں۔ ایسی صورت میں اس نسخہ کے راویوں کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے قطع نظر یہ بات بہرحال ثابت ہوتی ہے کہ وہ خود حضرت ابی بن کعبؓ کی تالیف نہ تھی' اور یوں وہ بات متحقق ہو جاتی ہے جو اس گفتگو کی ابتدا میں بیان کی گئی کہ دورِ صحابہؓ میں مستقل طور پر خاص تفسیر میں کوئی تالیف نہیں ہوئی۔

چند مثالیں

دورِ صحابہؓ میں تفسیر کی نوعیت سے متعلق اس بات کا تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ صحابہؓ کی تفسیر عام طور پر لغوی اور اثری ہوتی تھی اور ضرورت پڑنے پر وہ اپنی اجتہادی اور فقہی بصیرت کو بھی کام میں لاتے تھے۔ اب اسے ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں' اور یہ ساری مثالیں "الاتقان" سے ماخوذ ہیں [۷۷]۔ صاحبِ اتقان نے سب کا تذکرہ ان کے مآخذ و مراجع (بخاری' ترمذی' ابن جریر' مسند احمد بن حنبل وغیرہ) کے ساتھ کیا ہے۔

۱۔ حضرت ابن مسعودؓ' حضرت ابو ہریرہؓ (م ۵۸ھ) اور حضرت سمرہ بن جندبؓ (م ۵۸ھ) سے "حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" [۷۸] میں "الصَّلٰوة الوُسطٰى" کی تفسیر میں "نماز عصر" منقول ہے اور ان تینوں حضرات نے یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر بیان کی ہے۔

۲۔ سورۃ البقرہ رکوع ۲۱ میں کھانے پینے سے متعلق چند حرام چیزوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ "وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ" [۷۹]' اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "ذُبِحَ لِلطَّواغيت" (جو جانور طاغوتوں کے نام پر ذبح کئے جائیں)

۳۔ سورۃ البقرہ کی آیت وصیت (۱۸۰) کے جملہ "اِنْ تَرَكَ خَيْرًا" (مرنے والا اگر خیر چھوڑے) میں "خَيْرًا" کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ نے "مَالًا كثيرًا" (مال کثیر) سے فرمائی۔

۴۔ حضرت ابی بن کعبؓ سے "وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْيَزِيْدُوْنَ" [۸۰] کی تفسیر میں "يزيدون عشرين الفًا" (اس سے بیس ہزار زائد تھے' یعنی کل

ایک لاکھ بیس ہزار) منقول ہے اور انہوں نے یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر بیان کی ہے۔

۵۔ سورۃ المائدہ (آیت ۱۰۳) میں وارد شدہ لفظ "بُحَیرَۃ" کی تشریح میں حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا کہ

"یہ ایسی اونٹنی کو کہتے تھے کہ جب وہ پانچ دفعہ بچے جن چکتی تو پانچواں بچہ اگر نر ہوتا تو اسے ذبح کرکے اس کا گوشت صرف مرد کھاتے اور عورتیں نہیں کھاتی تھیں اور اگر وہ پانچواں بچہ مادہ ہوتا تو اس اونٹنی کے دونوں کان چیر کر اُسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔" (یعنی' پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا' نہ اس کا دودھ پیا جاتا' نہ اسے ذبح کیا جاتا' نہ اس کا اون اتارا جاتا۔ اسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے چرے اور جس گھاٹ سے چاہے پانی پیئے۔ یہ زمانہ جاہلیت کی ایک مذہبی رسم تھی)

پھر اس لفظ (بُحَیرَۃ) کے بعد وارد شدہ لفظ سَائِبَۃ اور وَصِیلَۃ اور حَام کی تفسیریں بھی حضرت ابن عباس ؓ نے فرمائی ہیں۔ لیکن چونکہ مقصود محض مثال دینا ہے' اس لئے اسی پر اکتفا کی جارہی ہے۔ بقیہ الفاظ کے بارے میں "الاتقان نوع ۳۶" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ حضرت ابن عباس ؓ قرآن کے مفرد الفاظ کی لغوی تشریح کے باب میں شعرائے جاہلیت کے اشعار سے استشہاد کیا کرتے' چنانچہ ایک موقع پر ان سے نافع بن ارزق[۸۱] اور نجدہ بن عویمر[۸۲] نے دوڈھائی سو کے قریب قرآنی الفاظ کے بارے میں دریافت کیا' اور حضرت ابن عباس ؓ نے ہر لفظ کی جو تشریح فرمائی تو اس کے ثبوت میں کسی نہ کسی شاعر کا شعر پڑھا' مثلاً

نافع : "عَنِ الْیَمِینِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِینَ" (المعارج : ۳۷) میں وارد شدہ لفظ "عِزِین" کا مفہوم کیا ہے؟

ابن عباس ؓ : لوگوں کے حلقہ بنالینے اور کسی کے ارد گرد جمع ہو جانے کو کہتے ہیں۔

نافع : کیا عرب اس مفہوم سے واقف ہیں؟

ابن عباس ؓ : ہاں' کیوں نہیں۔ کیا تم نے عبید بن الابرص[۸۳] کا یہ شعر نہیں سنا؟

فجاؤا بهرعون اليه حتى
يكونوا حول منبره عزينا ۸۴ ۔

نافع : "لَا فِيهَا غَوْل" (سورۃ الصافات آیت ۴۷ میں جنت کی شراب کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں غول نہ ہو گا) تو غول کسے کہتے ہیں؟

ابن عباس : سرگرانی و مدہوشی اور کراہیت کو۔

نافع : ثبوت؟

ابن عباس : امرؤالقیس ۸۵ کہتا ہے کہ :

رُبَّ كَأْسٍ شربتُ لا غول فيها
وسقيتُ النديم منها مزاجا ۸۶ ۔

۷۔ سورۃ البقرہ میں وہ عورت جس کا شوہر وفات پا جائے' اس کی عدت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ :

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ اَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۸۷

(یعنی) "جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں"۔

اور سورۃ الطلاق میں مطلقہ عورت کی عدت کے احکام کے سلسلے میں ارشاد ہوا ہے کہ :

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۸۸

(یعنی) "حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے"۔

اب واقعہ کی ایک نوعیت یہ سامنے آتی ہے کہ ایک حاملہ عورت کا شوہر وفات پا تا ہے' ایسی صورت میں اس کی عدت کیا ہو گی؟ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ وغیرہ نے یہ فرمایا کہ وضع حمل ہو گی۔ اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ نے فرمایا کہ وضع حمل اور چار ماہ دس دن میں سے جو مدت زیادہ ہو گی وہ اس کی عدت ہو گی ۸۹۔ یہ فقہی زاویۂ نگاہ سے صحابہؓ کے تفسیری افادات کی مثال ہے۔ گویا حضرت ابن مسعودؓ وغیرہ نے سورۃ البقرہ والی آیت کا محل ایسی غیر حاملہ عورتوں کو قرار دیا جن کے شوہر وفات پا

جائیں، خواہ ایسی صورت ہی کیوں نہ پیش آئے کہ کوئی شوہر اپنی غیر حاملہ بیوی کو طلاق دے اور دوسرے تیسرے دن اچانک شوہر کا ہارٹ فیل ہو جائے اور سورۃ الطلاق والی آیت کا محل حاملہ عورتوں کو قرار دیا، خواہ وہ مطلقہ ہوں اور ان کے شوہر زندہ ہوں یا مطلقہ نہ ہوں مگر ان کے شوہر وفات پا جائیں یا ایسی صورت رونما ہو کہ شوہر نے اپنی حاملہ بیوی کو طلاق دی اور دوسرے، تیسرے دن اچانک شوہر کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ جبکہ حضرت علیؓ وغیرہ نے دونوں آیتوں میں تطبیق کی ایک راہ اختیار فرمائی۔

صحابہؓ کا طریق تفسیر سادہ تھا

غرض، علامہ ابن تیمیہ کے قول کے مطابق، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو قرآن کے معانی و مطالب کی تعلیم دی جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تک قرآن کے الفاظ پہنچائے [۹۰]، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے سینوں کی امانتیں تابعین کی طرف منتقل ہوئیں اور چونکہ صحبتِ نبوی کے سبب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک ایسی فکری وحدت پیدا ہو گئی تھی جو دینی افتراق میں ان کو مبتلا نہیں ہونے دیتی تھی، اس لئے جو اجتہادی اختلاف ان کے درمیان کبھی ہوئے تو وہ بس اختلافِ رائے کی حد تک تھے اور کسی فرقہ بندی کا سبب نہ بنے۔

اگرچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اسلام دشمن خفیہ تحریک جو ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دینے کی خاطر عرصہ سے زیرِ زمین (Under ground) کام کر رہی تھی، جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کے نصف آخر میں نمودار ہوئی اور حضرت عثمانؓ کی شہادت (۳۳ھ) کے المیہ سے اسلام کو دوچار ہونا پڑا، تو سبائیت نے اپنی مقصد براری کے لئے جس طرح وضعِ حدیث کا فتنہ اٹھایا [۹۱] اسی طرح من مانی تاویل اور دور از کار تعبیر کے ذریعہ قرآن حکیم کو بھی استعمال کرنا شروع کر دیا، مثلاً حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ نے اپنے نزاع کے لئے جو تحکیم پر اتفاق کیا تو یہ سازشی تحریک [۹۲] کس طرح گوارا کر سکتی تھی کہ اس کی محنتوں پر پانی پھر جائے، اس لئے اس نے اپنے بطن سے خارجیت کو جنم دیا [۹۳]، جس نے یہ نعرہ لگایا کہ "لَا حُکۡمَ اِلَّا لِلّٰہ" [۹۴]۔ حالانکہ قرآن مجید میں وارد شدہ "اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ" [۹۵]

کو تحکیم کے ناجائز ہونے سے دور کا بھی واسطہ نہیں، کیونکہ خود قرآن حکیم نے ایک موقع پر شوہر اور بیوی کے درمیان نزاعی امور کے فیصلے کے لئے تحکیم کا طریقہ اس طرح بتایا ہے کہ :

فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا (النساء۔ ۳۵)

(اگر تم لوگوں کو شوہر اور بیوی کے درمیان تفرقہ کا اندیشہ ہو) تو ایک ثالث خاوند کے کنبے میں سے مقرر کرو اور ایک بیوی کے کنبے میں سے (مقرر کرو)"

اس طرح سیاسی گروہ بندیوں نے اسلام میں داخلی طور پر مستقل فرقہ بندیوں کی شکل اختیار کی، تاکہ آگے چل کر اسلام کو ملیا میٹ کرنے اور دین کا حلیہ بدل ڈالنے کی نت نئی چالیں اور تدبیریں کام میں لائی جاتی رہیں۔

اسی کے ساتھ تاریخ کو اس حقیقت کا بھی اعتراف ہے کہ ان فرقہ بندیوں سے صحابہؓ کا دامن پاک رہا اور یہی وجہ ہے کہ سبائیت ہو یا خارجیت، ہر خلافت کے لئے دردِ سری ہے اور ہر خلافت نے ہر ایک سے اپنی برأت ظاہر کی ہے، خواہ وہ حضرت علیؓ کی خلافت ہو یا حضرت معاویہؓ کی یا حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی۔

پھر صحابہؓ کا دور ابھی ختم نہیں ہوا ہے کہ ہم معبد الجہنی [۹۶] کو ایک ایسے عقیدے کی تخم ریزی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جس میں بندے کے اختیار کو کچھ اتنی آزادی اور اس قدر اونچی حیثیت کا مالک قرار دیا جاتا ہے کہ وہ قدرتِ الٰہی کو گویا چیلنج کرنے لگتا ہے، اور جس عقیدے کی بنیاد پر "قدریہ" نامی فرقہ پیدا ہوا [۹۷]، اور یہ فرقہ بھی اپنے باطل عقیدے اور نظریات کے لئے قرآن کو استعمال کر رہا تھا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود تفسیر قرآن کے باب میں صحابہؓ کی تعلیم کا طریقہ وہی سادہ رہا، جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے، اگرچہ حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ ان سارے باطل افکار و نظریات کی شدت کے ساتھ تردیدیں کرتے تھے۔

اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے اور وہ یہ کہ قرآن کی کسی آیت کے متعلق صحابہؓ کا محض یہ کہہ دینا کافی تھا کہ اس کا مفہوم و مدّعا اور اس کی مراد و منشا یہ نہیں ہے، کیونکہ جس ماحول

اور جس فضا میں قرآن کا نزول ہوا تھا صحابہؓ اس کے عینی شاہد تھے۔ مزید بر آں انہیں براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تفسیر کا علم حاصل ہوا تھا۔ پھر کس میں جرأت تھی جو صحابہؓ کے رُو در رُو یہ کہتا کہ اسلام اور قرآن کو آپ نے نہیں سمجھا یا ہم آپ سے زیادہ سمجھتے ہیں، خواہ اسلام کا کوئی معاند مذہبی لبادہ اوڑھ کر ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے کتنے ہی مقدس بھیس میں کیوں نہ سامنے آتا اور خواہ کوئی فکری داؤ پیچ اور ذہنی کشتی میں کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہوتا۔ اس لئے عام طور پر نجوئی اور سرگوشیوں سے یا خفیہ مراسلات اور معتمد علیہ خاص قاصدوں کے ذریعے یہ اسلام دشمن عناصر اپنی مہم چلا رہے تھے، اور اگر زبانیں کھلتیں بھی تو آوازیں دبی دبی سی ہوا کرتیں، جن کی تردیدیں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا صحابہؓ کرتے رہتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دورِ صحابہؓ میں نہ اس طرح کے مباحث اٹھے اور نہ ان میں اس طرح کا زور و شور پیدا ہوا جس طرح کے مباحث اور جن میں زور و شور کا مظاہرہ ہم کو بعد کے ادوار میں نظر آتا ہے۔

حواشی

۴۶۔ تفسیر ابن جریر طبری ج اول ص ۳۴ مطبوعہ مصر ۱۹۵۴ء و زرکشی۔ البرہان نوع ۴۱ بحوالہ بیہقی۔

۴۷۔ تفسیر ابن جریر طبری ج ا ص ۳۵ مطبوعہ مصر ۱۹۵۴ء و زرکشی۔ البرہان نوع ۴۱

۴۸۔ سیوطی۔ الاتقان نوع ۸۰

۴۹۔ بعض حضرات کے قول کے مطابق ۲۲ھ میں وفات ہوئی (ملاحظہ ہو علامہ ذہبی م ۷۴۸ھ کی تذکرہ الحفاظ جلد اول ص ۱۶ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۳۳ھ) اور بقول بعض ۳۲ھ میں وفات ہوئی (الاستیعاب ابن عبد البر)

۵۰۔ بقول بعض ۴۲ھ میں وفات ہوئی اور ایک قول ۵۲ھ کا بھی ہے۔

۵۱۔ بقول بعض ۵۴ھ میں وفات ہوئی اور ایک قول ۵۵ھ کا بھی ہے (تذکرۃ الحفاظ۔ ذہبی جلد اول ص ۲۹)

۵۲۔ زرکشی۔ البرہان نوع ۴۱

۵۳۔ بخاری۔ کتاب العلم

۵۴۔ ابن عبد البر م ۴۶۳ھ۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ج اول ص ۲۷۳ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۳۶ھ

۵۵۔ ابن عبد البر۔ الاستیعاب ج ا ص ۲۷۳

۵۶۔ سیوطی۔ الاتقان۔ نوع ۸۰

۵۷۔ سیوطی۔ الاتقان۔ نوع ۸۰

۵۸۔ مثلاً حضرت ابی بن کعبؓ سے مسروق (م ۶۳ھ) نے ایک دن ایک سوال کیا' حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا کہ "ایسا ہوا بھی ہے؟" انہوں نے جواب دیا کہ "نہیں" حضرت ابی بن کعب نے فرمایا کہ ابھی ٹھہریئے' جب ایسا واقعہ پیش آئے گا تو آپ کے لئے اجتہاد کی تکلیف کی جائے گی۔ (مولانا سعید انصاری۔ سیر انصار حصہ اول ص ۱۶۴ مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء بحوالہ مسند احمد حنبل ج ۵ ص ۱۳۲)

۵۹۔ طاش کبریٰ زادہ (م ۹۶۲ھ) مفتاح السعادہ و مصباح السیادہ جلد اول ص ۴۰۱ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۲۸ھ۔ و سیوطی۔ الاتقان نوع ۸۰

۶۰۔ طاش کبریٰ زادہ۔ مفتاح السعادہ ج ۱ ص ۴۰۱

۶۱۔ سیوطی۔ الاتقان نوع ۸۰

۶۲۔ سیوطی۔ الاتقان نوع ۸۰

۶۳۔ ابن حجر عسقلانی۔ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۳۹

۶۴۔ سیوطی۔ الاتقان نوع ۸۰ و طاش کبریٰ زادہ مفتاح السعادہ ج ۱ ص ۴۰۱

مفتاح السعادہ میں ابن حجر کا یہ جملہ منقول ہے کہ "بعد ان عرفت الواسطة وهی ثقة فلا ضیر فی ذلک" "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واسطہ (مجاہد) کو ثقہ کہہ رہے ہیں' اور اتقان میں بجائے "ھی" کے "ھو" ہے۔ اور "ھو" چونکہ ضمیر مذکر ہے اور لفظ "الواسطة" مونث ہے' جو اس کا مرجع نہیں ہو سکتا اس لئے بعض لوگوں نے اس کا مرجع علی بن ابی طلحہ کو ٹھہرایا ہے اور اس واسطہ سے روایت کرنے والا (علی بن ابی طلحہ) ثقہ ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن علی بن ابی طلحہ کے بارے میں جو معلومات ابن حجر نے دی ہیں وہ اسے ثقہ ٹھہرانے میں مانع ہیں.... ایسی صورت میں "ھو" کا مرجع مجاہد ہی ہیں' اور وہ اس طرح کہ ضمیر "ھو" لفظ "الواسطہ" کی مناسبت سے نہیں ہے' بلکہ اس سے جو مراد اور اس کا جو مصداق (مجاہد) ہے وہ مرجع ہے۔

۶۵۔ ابن حجر عسقلانی۔ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۳۹۔ ۳۴۰ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۲۶ھ

۶۶۔ علامہ ذہبی م ۷۴۸ھ۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال ج ۲ ص ۲۰۰ مطبوعہ مصر ۱۹۶۳ء

۶۷۔ یعنی پھر ان لوگوں کے بعد دوسرا طبقہ (اسی قبیل کی کتاب تفسیر کے مؤلفین کا) ہے جن میں عبدالرزاق اور علی بن ابی طلحہ اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم وغیرہ ہیں۔ (حاجی خلیفہ۔ کشف الظنون' جلد اول۔ عنوان "علم التفسیر")

۶۸۔ سیوطی۔ الاتقان۔ نوع ۸۰

۶۹۔ ابن حجر عسقلانی۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۳۸

۷۰۔ ابن حجر عسقلانی۔ تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۵۶

۷۱۔ ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ ج ۳ ص ۳۲۰

۷۲۔ ابن ندیم۔ الفہرست ص ۶۱ عنوان "الکتب المؤلفہ فی فضائل القرآن۔"

۷۳۔ حاجی خلیفہ۔ کشف الظنون جلد اول عنوان "علم التفسیر"

۷۴۔ حاجی خلیفہ کشف الظنون جلد اول عنوان "علم التفسیر"

۷۵۔ زرکشی۔ البرہان۔ نوع ۲۶

۷۶۔ اس تفسیر کی روایت ربیع بن انس نے ابو العالیہ سے کی ہے (حاجی خلیفہ۔ کشف الظنون ج ۱ ص ۲۳۴)

۷۷۔ ملاحظہ ہو علامہ سیوطی کی "الاتقان" نوع ۳۶ و نوع ۸۰

۷۸۔ ترجمہ: "اپنی نمازوں کی محافظت کرو' خصوصاً "الصلوٰۃ الوسطیٰ" کی" (البقرہ۔ ۲۳۸)

۷۹۔ "اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو" (البقرہ۔ ۱۷۳)

۸۰۔ "اور ہم نے اسے (حضرت یونس کو) بھیجا ایک لاکھ آدمیوں کی طرف یا اس سے زیادہ" (الصافات۔ ۱۴۷)

۸۱۔ خوارج کے فرقہ ازارقہ کا بانی و رئیس۔ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے خلاف ایک بڑی فوج کے ساتھ اس نے متعدد جنگیں کیں اور متعدد علاقوں پر قبضہ کر لیا' تا آنکہ مشہور سپہ سالار مہلب بن ابی صفرۃ (م ۸۲ھ) کو حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے اس کی سرکوبی کے لئے لکھا' چنانچہ مہلب سے ایک جنگ کے دوران ۶۵ھ میں مارا گیا۔ (ابو المظفر الاسفرائنی م ۴۷۱ھ۔ التبصیر فی الدین ص ۵۰ مطبوعہ مصر ۱۹۵۵ء) علامہ زاہد الکوثری (م ۱۳۷۱ھ) التبصیر فی الدین ص ۵۰ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ یہی وہ نافع بن الازرق ہے جس نے بہت سے قرآنی الفاظ کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ سے سوالات کئے تھے اور انہوں نے برجستہ سب کے جوابات دیئے اور ہر شعر کے ثبوت میں شعرائے عرب کے کلام سے استشہاد لیا۔ میں نے ان سوالات و جوابات پر مشتمل قلمی کتابچہ کتب خانہ ظاہریہ دمشق میں دیکھا ہے۔

۸۲۔ خوارج کے ایک دوسرے فرقہ (نجدیہ) کا بانی.... عبد القاہر بغدادی م ۴۲۹ھ (الفرق بین الفرق مطبوعہ مصر ص ۸۷) اور ابو المظفر الاسفرائنی (التبصیر فی الدین ص ۵۱) ان سب لوگوں نے نجدہ بن عویمر کے بجائے نجدہ بن عامر لکھا ہے۔

۸۳۔ متوفی ۵۵۰ھ

۸۴۔ "وہ اس کی جانب دوڑتے ہوئے آئے تاکہ اس سے [illegible] کر حلقہ باندھ کر استادہ ہو جائیں"۔

۸۵۔ متوفی ۵۳۹ھ

۸۶۔ "میں نے کتنے ہی جام شراب پی ڈالے کہ جن میں بدبو اور سرگرانی نہ تھی (کہ میں مدہوش ہو جاتا) لیکن اس میں سے جب میں نے کچھ شراب اپنے ہم نشیں کو پلائی تو (اس کی تلخی

تیزی کم کرنے کے لئے) مجھے پانی ملانا پڑا (کہ وہ درد سر میں مبتلا نہ ہو اور بہکنے نہ پائے) "

۸۷۔ سورۃ البقرہ۔ ۲۳۴

۸۸۔ سورۃ الطلاق۔ ۵

۸۹۔ ابو بکر جصاص م ۳۷۰ھ۔ احکام القرآن جلد اول ص ۴۹۱ مطبوعہ مصر ۱۳۴۷ھ علامہ جصاص نے یہاں ایک تیسرے مسلک کا بھی تذکرہ کیا ہے اور وہ یہ کہ حسن (غالباً حسن بن صالح م ۱۶۹) سے مروی ہے کہ ایسی عورت کی عدت وضع حمل کے بعد نفاس سے طاہر ہو جاتا ہے۔

۹۰۔ ابن تیمیہ۔ رسالہ اصول تفسیر

۹۱۔ عبداللہ بن سبا' جو یمن کا ایک یہودی تھا اور جس نے محض اسلام کو تاراج کر دینے کی غرض سے منافقانہ طور پر اسلام قبول کیا تھا' اس کے بارے میں علامہ ابن حجر عسقلانی امام شعبی (م ۱۰۳ھ) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "سب سے پہلے جس نے جھوٹی حدیثیں گھڑیں' وہ یہی ابن سبا تھا۔" (ملاحظہ ہو لسان المیزان ج ۳ ص ۲۸۹ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۳۰ھ)

۹۲' ۹۳۔ فرقوں کے ظہور و نمود سے متعلق کتب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے اور پوری دقتِ نظر کے ساتھ تحقیق و تفحص سے کام لیا جائے تو انسان اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہودیت و نصرانیت باہمی اختلاف بلکہ باہمی رقابت و عناد کے باوجود عہد رسالت ہی سے اسلام کے خلاف محاذ قائم کرتے چلے آئے ہیں اور عہد رسالت کے بعد جنگی محاذ سے زیادہ انہوں نے فکری محاذ پر کام کیا ہے اور اسلام کے سرمایہ خصوصاً اعتقادات میں ریب و تشکیک ڈالنے کی خاطر انہوں نے زہریلی فکری غذا دینے کی عجیب و غریب تدبیریں اختیار کی ہیں اور دین کو مسخ کر دینے والے نظریات و تصورات کو پھیلانے سے متعلق اپنی سازشوں کو بروئے کار لانے کے لئے نت نئی چالیں چلی ہیں' کہیں کسی بھیس میں سامنے آئے اور کبھی کوئی روپ دھارا' چنانچہ یہ یہودیت ہی تھی جس کا ایک مہرہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا اور پھر یہ یہودیت ہی تھی جس نے سبائیت کو جنم دیا' اور پھر سبائیت وہ ام الفرق بنی جس کی کوکھ سے کچھ تو براہ راست فرقے پیدا ہوئے اور کچھ بعد میں اس کے حفداء اور نوافل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۹۴۔ مورخین اسلام کے بیانات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ صفین میں جب اہل شام نے نیزوں پر قرآن اٹھایا تو خود حضرت علیؓ کی فوج میں اشعث بن قیس وغیرہ جو بڑے بڑے قائدین فوج تھے' ان میں سے سوائے اشتر کے بقیہ تقریباً سبھی نے حضرت علیؓ پر زبردست دباؤ ڈالا کہ جنگ بند کر دی جائے اور جب انہوں نے جنگ بند کر دی اور اپنے لشکر کی اس عظیم اکثریت کے اصرار کے مطابق حکم مقرر کر دیا تو پھر بالفاظ ذہبی "قَالَت طَائفة لاحکمَ الا للہ وخرجوا علیہ فھم الخوارج " یعنی ' اہل عراق کے اس لشکر کے ایک گروہ نے کہا کہ "لاحکم الا للہ " (فیصلے کا اختیار تو بس اللہ ہی کو ہے) اور حضرت علیؓ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور خروج کیا اور یہی خوارج کے نام سے موسوم ہوئے۔

(باقی صفحہ ۴۷ پر)